شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں میری بات !

خالد سیف اللہ رحمانی ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين
وعلى آله وأصحابه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد !

عزیزانِ گرامی ! اللہ کا شکر واحسان ہے کہ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے قیام پر ۱۰ سال کا عرصہ گذر چکا ہے، اب وہ اپنی عمر کے گیارہویں سال میں ہے، اس درمیان رہروانِ علم ونظر کے کئی قافلے آئے، اس گلشن فکرو نظر میں خیمہ زن ہوئے، جو کچھ خوشبو انہیں میسر آئی، اس کی سوغات اپنے ساتھ لے کر ملک کے مختلف علاقوں میں پہنچے، آج پھر چند لمحات کے لئے یہ بکھرے ہوئے غنچہ وگل یہاں جمع ہیں، اس موقع پر آپ کے اساتذہ اور اس ادارہ کے منتظمین کو جو مسرت ہوسکتی ہے، شاید کسی پیمانہ کے ذریعہ اس کو تولنا ممکن نہ ہو؛ کیوں کہ اداروں کی پہچان خشت وسنگ کی عمارتوں سے نہیں ہوتی، اُن افراد سے ہوتی ہے، جو اُن کی آغوش تربیت سے فیض یاب ہوکر نکلتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان توقعات کو پوری فرمائے، جو آپ سے متعلق امت نے قائم کی ہیں اور ان آرزوؤں کو برلائے، جو اس ادارہ نے آپ سے وابستہ رکھی ہیں۔

فضلاء عزیز! اگر سوال کیا جائے کہ اس ادارہ کے قیام کا مقصد کیا ہے اور بہت سی دینی درسگاہوں کے موجود ہوتے ہوئے اس کی کیا ضرورت تھی؟ اور ایک لفظ میں اس کا جواب مانگا جائے تو شاید اس کا جواب ہوگا: دینی کاموں میں 'احسان' کا حامل بنانا، — احسان سے مراد یہ ہے کہ جس کام کو کیا جائے خوش سلیقگی کے ساتھ اور درست طریقہ پر کیا جائے، اللہ تعالیٰ کی عبادت وبندگی میں احسان یہ ہے کہ انسان یوں محسوس کرے کہ گویا اس کا خدا اس کے سامنے ہے، بندہ اپنے رب کو دیکھ رہا ہے اور کم سے کم یہ تصور ہو کہ خدا کی نگاہ اس کے بندہ کی طرف متوجہ ہے: '' **أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك** ''(صحيح البخاري ، كتاب الإيمان ، باب سؤال جبريل عليه السلام النبي ﷺ عن الإيمان والإسلام، حدیث نمبر: ۵۰) نماز کی صفیں بن رہی ہوں تو احسان یہ

☆ خادم: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

ہے کہ صفیں درست ہوں، بکھری ہوئی نہ ہوں، (صحیح مسلم ، کتاب الصلاۃ ، باب تسویۃ الصفوف ..... ، حدیث نمبر:۱۰۰۳، سنن النسائی ، کتاب الجنائز ، باب فضل من صلی علیہ مائۃ، حدیث نمبر:۲۰۰۵) بال رکھتا ہو تو احسان یہ ہے کہ بال الجھے ہوئے نہ ہوں، آپس میں معاملات کئے جائیں تو احسان یہ ہے کہ ایثار سے کام لیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے ہر چیز میں احسان کو ضروری قرار دیا ہے: ''**إن اللہ عز وجل کتب الإحسان علی کل شئ**'' (سنن ابن ماجۃ ، کتاب الذبائح ، باب إذا ذبحتم فأحسنوا الذبح ، حدیث نمبر:۳۱۷۰) یہاں تک کہ اگر کسی مستحق قتل کو قتل کرو تو اس میں بھی احسان ہو اور کسی جانور کو ذبح کرو تو اس میں بھی احسان کا پہلو ملحوظ رکھو: ''**فإذا قتلتم فأحسنوا القتلۃ وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح**'' (حوالہ سابق) غرض کہ زندگی کے ہر کام میں احسان کا پہلو ہو، تعلیم وتربیت کار ہائے نبوت میں سے ہے، اس کی فضلیت کے کیا کہنے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس میں بھی اجر وثواب کو احسان سے مربوط فرمادیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''**علمھا فأحسن تعلیمھا وأدبھا فأحسن تأدیبھا**''۔ (صحیح البخاری ، کتاب النکاح ، باب اتخاذ السراری، حدیث نمبر:۵۰۸۳)

غرض احسان کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں اور دین کے تمام کاموں سے ہے، اگر آپ امام ہوں تو بہتر امام ہوں، آپ حسن قرأت اور افعال صلاۃ میں تعدیل کے ساتھ نماز پڑھائیں اور اپنے مقتدیوں کی نماز کے بارے میں بھی فکر مند رہیں، رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر خشوع وخضوع کس کی نماز میں ہوسکتا تھا؛ لیکن پھر بھی آپ گوشۂ چشم سے مقتدیوں کے افعال کو ملاحظہ کرتے رہتے تھے اور حسب ضرورت ان کی اصلاح فرماتے تھے، اگر آپ جمعہ وعیدین کے خطیب ہوں تو آپ کی خطابت کا ایک معیار ہو، سلیقہ مندی اور نرمی کے ساتھ اپنی بات کو پیش کریں، مدعو کتنا بھی خودسر اور بداخلاق ونافرمان ہو؛ لیکن داعی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی زبان میں قند ونبات کی مٹھاس اور شبنم کی ٹھنڈک ہو؛ چنانچہ حضرت موسی علیہ السلام وہارون علیہ السلام سے فرمایا گیا: ''**فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا**'' (طٰہٰ:۴۴) آپ کی گفتگو سے محسوس ہو کہ آپ کی انگلیاں زمانہ کی نبض پر ہیں اور وقت کی دھڑکنوں کو آپ سمجھتے ہیں، آپ کی نصیحتیں قرآن مجید کی آیات، معتبر احادیث اور صحابہ کے مستند واقعات پر مبنی ہوں، اگر آپ مدرس ہوں تو آپ کی زبان شائستہ ہو، آپ کا سینہ طلبہ کی محبت سے معمور ہو، آپ اپنے موضوع پر مطالعہ کا حق ادا کریں، آپ کی تفہیم مرتب اور آپ کی زبان شائستہ ہو، نیز آپ جدید طریقۂ تعلیم سے بھی آشنا ہوں، اگر آپ داعی ہوں تو جس بات کی دعوت دے رہے ہوں خود آپ کے اندر اس کا بھرپور یقین ہو، مدعو کی نجات کی فکر آپ کو خون کے آنسو رلاتی ہو، اور جب آپ ان سے گفتگو کرتے ہوں تو آپ کی زبان سے محبت وپیار کے پھول جھڑتے ہوں، اگر آپ افتاء کی خدمت انجام دے رہے ہوں تو آپ میں تحقیق کا جذبہ اور آنکھوں کا چراغ جلانے کا حوصلہ ہو؛ کیوں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''**من أفتی بغیر**

علم کان إثمه علی من أفتاه ''(سنن أبي داؤد ، کتاب العلم ، باب التوقی في الفتیا ،حدیث نمبر:۳۶۵۹)
آپ زمانہ کے احوال ،شریعت کے مقاصد اور لوگوں کی مصالح سے بھی واقف ہوں ،اس بات کا بھی ادراک رکھتے ہوں کہ مسلم اکثریت ممالک اور مسلم اقلیت ممالک ،قدیم الاسلام مسلمانوں اور حدیث الاسلام مسلمانوں کی صورتحال مختلف ہوتی ہے ،اگر آپ منصب قضا پر فائز کئے جائیں تو اس موضوع پر پوری بصیرت حاصل کریں ، جو مسائل آپ کے سامنے آئیں ان میں قرآن وحدیث اور مذاہب اربعہ پر آپ کی نظر ہو ،آپ کے ورع واحتیاط اور عدل وانصاف کے دامن پر دھبہ نہ لگ جائے ،اور کبھی متانت ووقار کے خلاف کوئی بات آپ سے سرزد نہ ہونے پائے ۔

اگر آپ کا تعلق صحافت اور تصنیف وتألیف سے ہو تو آپ کے قلم اٹھانے کا مقصد یا تو اسلام کی دعوت ہو یا اسلام کی حفاظت ، یا شریعت اسلامی کی تحقیق ووضاحت ، نہ آپ کی منزل شہرت وناموری ہو اور نہ آپ کا مقصد درہم ودینار ہو ،آپ کی ہر تحریر وسیع تحقیق اور گہری فکر پر مبنی ہو نہ کہ سنی سنائی باتوں کو نقل کرنے پر ،غرض آپ زندگی کے جس شعبہ میں ہوں ، وہاں اپنے آپ کو اسلام کا سپاہی ، دین کا نقیب اور شریعت اسلامی کا ترجمان سمجھیں اور اپنی طاقت بھر علم وتحقیق ،حسنِ اخلاق ، ورع واحتیاط اور اتباع شریعت وسنت کے لحاظ سے اس مقام پر ہوں کہ لوگ آپ کو نمونہ بنانا چاہیں ۔

حضرات ! غالباً 'احسان' کی یہی مراد ہے اور معہد کے قیام کا بنیادی مقصد یہی ہے ،اس کے ساتھ ساتھ اسی ذیل میں چند نکات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے ، جو آپ کے مادر علمی کے مزاج میں داخل ہے اور جس کی اس وقت امت کو صحیح راستہ پر قائم رکھنے کے لئے سخت ضرورت ہے :

اعتدال فکر

قانون فطرت یہ ہے کہ بڑی سے بڑی نعمت بھی اگر حد اعتدال سے بڑھ جائے تو وہ انسانیت کے لئے رحمت کی بجائے زحمت بن جاتی ہے ،ہَوا پر انسانی زندگی کا مدار ہے ؛لیکن آندھی چلنے لگے اور طوفان اٹھ کھڑا ہو تو یہی ہَوا انسانیت کے لئے تباہی وبربادی کا سبب بن جاتی ہے ، پانی زندگی کے لوازم میں سے ہے ،قرآن نے خود اسے سرچشمۂ حیات قرار دیا ہے :''وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاء كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ''(الأنبیاء:۳۰)لیکن جب سمندر اور دریا ابل آتے ہیں اور آبادیوں میں پانی داخل ہو جاتا ہے تو یہی پانی کتنے ہی جانوروں اور انسانوں کے لئے پروانۂ موت بن جاتا ہے ،فکر وعمل کی بے اعتدالی بھی اسی طرح انسان کو نقصان پہنچاتی ہے ،عیسائیوں نے رجال اللہ کے معاملہ میں افراط سے کام لیا اور یہودیوں نے تفریط سے ؛اسی لئے ایک ''ضَالِّيْنَ '' کہلائے اور دوسرے ''**مغضوب علیهم** '' یہ حقیقت میں فکری بے اعتدالی ہی کا نتیجہ ہے !

خود امت میں اہل سنت والجماعت کے مسلک کا امتیاز 'اعتدال' ہے، مرجیہ نے اعمال کی اہمیت ختم کردی اورخوارج نے اعمال کی اہمیت میں غلو سے کام لیا؛ حالاں کہ ان کے اندر ظاہری دینداری کی کوئی کمی نہیں تھی، روافض نے اہل بیت کی محبت میں غلو سے کام لیا اور ناصبیہ نے تفریط کا راستہ اختیار کیا؛ اسی لئے دونوں گمراہ کہلائے، اہل سنت والجماعت نے ان کے درمیان اعتدال اور میانہ روی کا راستہ اختیار کیا، جو صراط مستقیم ہے اور دین میں مطلوب ہے۔

علماء کے لئے ہر زمانہ میں اسی طرز عمل کو اختیار کرنا ضروری ہے، بعض اعتقادی مسائل میں عہد صحابہ میں بھی اختلاف ہوا ہے، اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ بھی صفات باری کی تشریح اور بعض دوسرے مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف رہے ہیں، ایسے مسائل میں ایک نقطۂ نظر کو حق وہدایت کی اساس سمجھ لینا غلو اور بے اعتدالی ہے، احکام فقہیہ میں بعض نصوص پر مبنی ہیں اور بعض غیر منصوص ہیں، پھر منصوص مسائل میں کچھ وہ ہیں، جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہیں اور کچھ نصوص ظنیہ سے، بعض نصوص اپنے معانی اور مفاہیم کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں اور بعض میں ابہام ہے، بعض احکام فقہاء کے اجتہاد پر مبنی ہیں اور ان میں قیاس واجتہاد کے ایک سے زیادہ پہلو ہیں، ان تمام کو ایک ہی درجہ میں نہیں رکھا جاسکتا، اسی طرح تقلید ایک ضرورت ہے اور یہ موجودہ دور میں اتباع شہوات سے بچانے کا ایک اہم ذریعہ ہے؛ لیکن بہت سے مسائل میں خود صاحب مذہب سے مختلف اقوال منقول ہیں، بعض مسائل صاحب مذہب کے اجتہاد پر مبنی نہیں؛ بلکہ متبعین مذہب کے اجتہاد پر مبنی ہیں، جس کو فقہ کی اصطلاح میں ''تخریج'' کہتے ہیں، پھر اس اجتہاد میں مختلف متبعین مذہب کے الگ الگ اقوال ہیں، مقلدین کے لئے یہ تمام احکام ایک درجہ کے نہیں ہیں۔

اسی طرح شارع کی نصوص اور فقہاء کے اجتہادات یکساں نہیں ہیں؛ کیوں کہ نص معصوم ہے اور اجتہاد میں خطا کا احتمال ہے؛ اسی لئے ہر دبستانِ فقہ میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ بوقت ضرورت دوسرے مذاہب کی آراء سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، یا مذہب کے قول ضعیف کو بھی لیا جاسکتا ہے؛ البتہ یہ کام اصحاب تحقیق علماء اور زمانہ شناس فقہاء کے کرنے کا ہے، نہ یہ درست ہے کہ ہم اپنے سلف صالحین سے بدگمان ہوجائیں، اپنے آپ کو ان کے اجتہادات سے آزاد کرلیں، اور تقلید کو غیر ضروری سمجھنے لگیں، اور نہ یہ درست ہے کہ ہم فقہاء کے اقوال واجتہادات کو کتاب وسنت کے درجہ میں رکھ دیں، اور اس سے ایک سرمو ہٹنے کو بھی ضلالت وگمراہی تصور کریں۔

یہی فکر تھی شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی، یہی نقطۂ نظر تھا مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کا، اسی راہ کو اختیار کیا مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا اشرف علیہ تھانویؒ نے، اس فکری اعتدال کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ امت میں اتحاد قائم ہوتا ہے، فاصلے گھٹتے ہیں، غیر حقیقی مسائل میں اُلجھنے کی بجائے حقیقی مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ ہوتی ہے، لوگوں میں شریعت کی محبت پیدا ہوتی ہے اور ان کا یقین بڑھتا ہے کہ شریعت اسلامی زندگی کے تمام مسائل کو حل کرنے کی

صلاحیت رکھتی ہے، اس اعتدال کا امتحان اس وقت ہوتا ہے، جب کسی فریق کی طرف سے بے اعتدالی کا اظہار ہو، تو انسان کے اندر ردعمل پیدا ہوتا ہے اور یہ ردعمل حد سے تجاوز کرتے ہوئے غلو میں داخل ہو جاتا ہے، ایسے وقت میں اعتدال کے دامن کو تھامے رکھنا اور غلو کی روش سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا آسان نہیں ہوتا، قرآن مجید میں انبیاء کے اپنی قوم سے خطاب، قوم کی طرف سے نامعقولیت کا اظہار اور پھر انبیاء کرام کے جوابات کو دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سخت سے سخت گفتگو پر بھی ان میں منفی ردعمل واشتعال پیدا نہیں ہوتا تھا، علماء ربانیین اور داعیان دین متین کی شان یہی ہے۔

اعتدال ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر اور دبستان فقہ کی اہم شخصیتوں کا احترام ملحوظ رکھا جائے، انسان اپنے بارے میں بدگوئی کو گوارا کر لیتا ہے؛ لیکن جو اس کا رہبر ومقتدیٰ ہو، وہ اس کی ذرا بھی بے احترامی کو گوارہ نہیں کرتا، قرآن مجید نے لوگوں کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے معبودان باطل کو بھی برا بھلا کہنے سے منع فرمایا ہے؛ (الأنعام:۱۰۸) کیوں کہ اس سے نفرتیں بڑھتی ہیں، امن وآشتی کا ماحول متأثر ہوتا ہے، یہی طریقہ سلف صالحین کا رہا ہے، علامہ زمخشریؒ معتزلی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود اہل سنت ان کا نام احترام سے لیتے رہے ہیں، یہاں تک کہ کثرت عبادت کی وجہ سے ان کا لقب 'جار اللہ' پڑ گیا تھا، بہت سے علماء اہل سنت ان کا ذکر اسی لقب سے کرتے ہیں، بعض اور معتزلی محدثین فقہاء کے تذکرہ میں اکابر علماء اہل سنت نے اس پہلو کو ملحوظ رکھا ہے، اسی طرح کسی گروہ یا کسی شخص سے کتنا بھی اختلاف ہو، اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنا چاہئے، محدثین وماہرین اسماء رجال کو دیکھئے کہ بہت سے منحرف فرقوں کے روات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی فکر باطل کا بھی ذکر کرتے ہیں اور ان کو 'ثقہ وصدوق' بھی قرار دیتے ہیں، خود امام بخاری کے یہاں سو کے قریب روات ہیں، جن کی نسبت فرق مبتدعہ کی طرف کی گئی ہے۔

اعتدال کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ایک شخص نے بصیرت کے ساتھ جس بات کو درست سمجھا ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ اس سے ہٹ جائے اور منحرف افکار سے متأثر ہو جائے، اپنی فکر پر استقامت ہونی چاہئے اور جن افکار کو وہ نا درست سمجھتا ہے، ان پر حسب ضرورت دلیل کے ساتھ سنجیدہ زبان، نرم لب ولہجہ، داعیانہ اسلوب اور ناصحانہ انداز میں نقد بھی کر سکتا ہے؛ بلکہ بعض دفعہ ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے، اتنی رواداری نہ ہو کہ انسان اپنی شناخت سے محروم ہو جائے اور اتنا تشدد نہ ہو کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع ختم ہو جائے۔

عصری تقاضوں کا شعور

اللہ نے زمانہ کی قسم کھائی ہے، (العصر:۱) اس سے زمانہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، زمانہ کی اہمیت کا ایک

پہلو یہ ہے کہ وہ ایک تغیر پذیر شئ ہے، زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ثقافتی، اخلاقی، فکری اور سیاسی تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں، ان تبدیلیوں کا شعور علماء کے لئے ضروری ہے، امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دین حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک ایک ہی رہا ہے؛ کیوں کہ دین کی بنیاد ایمانیات پر ہے اور ان میں تبدیلی ناقابل تصور ہے؛ لیکن شریعت مختلف ادوار میں بدلتی رہی ہے؛ کیوں کہ شریعت کا تعلق عملی احکام سے ہے اور مختلف اسباب کی وجہ سے عملی زندگی کے تقاضے ہمیشہ یکساں نہیں رہتے، یہ گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ عصری تبدیلیاں انسان کے فکر وعمل اور تہذیب وثقافت پر اثر انداز ہوتی ہیں، علماء کے لئے ضروری ہے کہ اس پر ان کی نگاہ ہو؛ اسی لئے امام ابو یوسف کی طرف یہ قول منسوب ہے اور بہت سے فقہاء نے اس کا ذکر کیا ہے کہ جو اپنے زمانہ کے لوگوں سے واقف نہ ہو وہ عالم ناآشنا ہے: ''**من لم یعرف أهل زمانه فهو جاهل**''۔

زمانہ شناسی کی ضرورت ہر میدان کے لئے ہے، ہم نے اپنی کتابوں میں فرق باطلہ اور افکار زائغہ کا ذکر پڑھا ہے، جن کا ذکر سلف نے اپنے عہد کے پس منظر میں کیا ہے؛ لیکن آج کے افکار الگ ہیں، اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات بھی الگ ہیں، اور ان کو ثابت کرنے کا اسلوب بھی الگ ہے، جس طرز استدلال سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ بھی جداگانہ ہے، سیاسی نظام بدل چکا ہے، اقتصادیات کا ایک نیا نظام وجود میں آچکا ہے، اور پوری دنیا سمٹ کر گاؤں بن چکی ہے، نئے نئے وسائل پیدا ہوئے ہیں اور ان وسائل وذرائع نے نہ صرف آسانیاں پیدا کی ہیں؛ بلکہ اندازِ فکر پر بھی اثر ڈالا ہے، علماء کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف ماضی کے حصار میں مقید نہ رہیں؛ بلکہ اپنے عہد کے افکار، ان افکار کے اسباب، اپنے عہد کے تقاضوں اور ضرورتوں نیز اس دور کے طرز استدلال سے واقف ہوں، شاہ ولی اللہ صاحب کی معروف ومقبول تألیف ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی پذیرائی کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ اپنے عہد کی عقلی افتاد کے پس منظر میں لکھی گئی ہے، اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا یہی امتیاز ہے کہ انھوں نے ایک جدید علم کلام کی بنیاد رکھی اور نظری استدلالات کی بجائے محسوسات سے معنویات کو ثابت کیا، بہرحال یہ بات ضروری ہے کہ ہم جس میدان میں بھی کام کریں، اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھیں اور لوگ محسوس کریں کہ ہم آثار قدیمہ نہیں ہیں؛ بلکہ ایک باشعور، زمانہ شناس اور بلند نگاہ گروہ ہیں۔

دفاع عن الدین

دعوت اصل میں دین کی ہے نہ کہ مسلک ومشرب کی، سلف صالحین نے کبھی کسی کو اپنے مسلک کی طرف آنے کی دعوت نہیں دی، اہل علم کے لئے یہ واقعہ محتاجِ اظہار نہیں کہ جب امام مالکؒ کی فقہ پر عباسی خلفاء نے پوری

امت کو جمع کرنے کی کوشش کی تو امام مالکؒ نے اس سے منع فرمادیا، اس سے جہاں امام مالک کا اخلاص، للّٰہیت اور خدا ترسی معلوم ہوتی ہے، وہیں یہ پہلو بھی واضح ہوتا ہے کہ ہمارے سلف صالحین نے کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ فروع دین میں سارے لوگ ہماری فکر پر آجائیں، انہوں نے اختلاف رائے کا احترام کیا اور اُمت کے لئے اسے رحمت سمجھا، دعوت جس چیز کی مطلوب ہے، وہ دین ہے؛ اس لئے اصل میں دفاع بھی دین ہی کا واجب ہے۔

بعض دفعہ فروعی اور مسلکی اختلاف میں غلو کی وجہ سے لوگ 'دفاع عن الدین' کی بجائے 'دفاع عن المسلک' کو اپنی مہم اور اپنی سعی وکاوش کا محور بنالیتے ہیں، ہندوستان کی دو عظیم اور تاریخی درسگاہوں —— دار العلوم دیوبند اور دار العلوم ندوۃ العلماء —— کے بانیان میں ایک بات مشترک معلوم ہوتی ہے کہ ان کی توجہ زیادہ تر اسلام کے خلاف ہونے والی فکری یلغار تھی اور دین کے دفاع کو انھوں نے اپنی زندگی کا مشن بنایا تھا، ایک آدھ مختصر تحریر کو چھوڑ کر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تمام کتابیں آریہ سماجیوں اور عیسائیوں کے رد میں اور اسلام کے خلاف کئے جانے والے اعتراضات کے جواب میں ہیں، اگر بہ تقاضائے ضرورت اہل سنت کے کسی گروہ یا اہل قبلہ میں سے کسی باطل فرقہ کے خلاف لکھا ہے تو اس کا لب ولہجہ بہت نرم اور انتہائی ناصحانہ ہے، جبکہ معاندین اسلام کے خلاف آپ کا قلم شمشیر برہنہ ہے، یہی مزاج ہمیں حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے یہاں ملتا ہے، انہوں نے اپنی پوری زندگی فتنۂ قادیانیت، عیسائیت اور آریہ سماجیت کے رد میں صرف فرمائی اور ایک بڑے علاقہ کو کفر وارتداد کے فتنہ سے بچایا، دوسری طرف مسلکی اور فروعی اختلافات پر قلم اٹھانے سے گریز کیا اور اہل سنت کے مختلف طبقوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کرنے کے لئے 'تحریک ندوۃ العلماء' کی بنیاد رکھی۔

اس وقت صہیونی اور صلیبی طاقتیں کمر بستہ ہیں کہ جو مسلمان دین سے دور ہیں، ان میں علاقائی، لسانی اور نسلی بنیادوں پر افتراق پیدا کیا جائے اور جو مسلمان دین سے مربوط ہیں، انہیں مسلکی جھگڑوں میں الجھایا جائے، ضروری ہے کہ علماء اس صورت حال کو سمجھیں اور سوچیں کہ کہیں ہم نادانستہ طور پر پورے جذبۂ اخلاص کے ساتھ اعداء اسلام کے آلۂ کار تو نہیں بن رہے ہیں؟

فکرِ اُمت

علماء کے لئے جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے، وہ ہے اُمت کی فکر، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**من لم یهتم للمسلمین فلیس منهم**'' (المستدرک حاکم، کتاب الرقاق، حدیث نمبر: ۷۹۰۲) ''جس کو مسلمانوں کے مسائل کی فکر نہ ہو، وہ مسلمانوں میں نہیں ہے'' پھر آپ ﷺ نے یہاں فکر کے لئے ''**ھم**'' کا لفظ فرمایا ہے، جس کے معنی 'گہری فکر' کے ہیں، ایسی فکر جو انسان کو بے قرار کردے، پس جیسی فکر انسان اپنے لئے اور اپنے قریبی متعلقین

کے لئے کرتا ہے، ویسی ہی فکر اس کے دل میں پوری اُمت کی پیدا ہو جائے۔

یہ جہت اس وقت علماء کی بہت کمزور ہوگئی ہے، ہم مدرس ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام چند گھنٹے پڑھا دینا ہے، نہ ہمارے دل میں بچوں کی محبت، نہ ان میں لیاقت پیدا کرنے کی فکر، نہ علم کی امانت دوسروں تک پہونچانے کے لئے کوئی بے قراری؛ حالاں کہ جو بچے ہمارے زیر درس ہیں، ان کے بارے میں ہم دنیا سے آخرت تک جواب دہ ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**کلکم راع و کلکم مسؤول عن رعیته**'' (صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة في القری والمدن، حدیث نمبر: ۸۹۳) ہم امام ہیں تو ہم نے سمجھا کہ ہمارا کام صرف نماز پڑھا دینا ہے، مصلیوں اور محلّہ والوں کے دینی و دنیوی مسائل کے بارے میں ہماری کوئی ذمہ داری نہیں؛ حالاں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**الإمام ضامن**'' (سنن أبي داؤد، کتاب الصلاة، باب ما یجب علی المؤذن من تعاهد الوقت، حدیث نمبر: ۵۱۷) فقہاء نے اس سے یقیناً نماز کے بعض اہم مسائل اخذ کئے ہیں؛ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ لفظ عام ہے، یعنی امام مقتدیوں کا، مصلیانِ مسجد کا اور محلۂ مسجد کا ذمہ دار ہے، ذمہ دار ہے ان کو نماز پڑھانے کا، وہ ذمہ دار ہے ان کی نمازوں کے درست کرنے کا، وہ ذمہ دار ہے ان کی دینی تعلیم و تربیت کرنے کا، وہ ذمہ دار ہے مسلمان بچوں اور ان کے سرپرستوں کو عصری تعلیم کی طرف راغب کرنے کا، اس محلّہ میں سماجی اصلاح کی تحریک چلانے کا، خدمت خلق کے کاموں کے منظّم کرنے کا، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کو خوش گوار بنانے کا، خاندانی تنازعات کو طے کرنے کا، غرض کہ وہ اقبال کی زبان میں صرف 'دو رکعت کا امام' نہیں ہے؛ بلکہ اپنے حلقہ کے مسلمانوں کی پوری زندگی کا امام ہے، اگر علماء اس طرح امامت کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور کام کریں تو یقیناً ہمیں قوم کے پیچھے چلنا اور دست سوال دراز کرنا نہیں ہوگا؛ بلکہ امت ہمارے پیچھے چلے گی، اور ہمیں سر آنکھوں پر رکھے گی۔

اُمت کی فکر کے مفقود ہو جانے اور سماج سے کنارہ کشی اختیار کر لینے کی وجہ سے آج مسلمانوں کی نئی نسل مغربی تہذیب کی برائیوں کو قبول کرتی جارہی ہے اور تہذیبی ارتداد سے آگے بڑھ کر ایمانی ارتداد تک پہنچ چکی ہے، اُمت بننے کی بجائے ایک گروہ بننے کا مزاج ہمارے اندر کچھ اس طرح رچ بس گیا ہے کہ دین کے ہر چھوٹے بڑے مسئلہ کو ہم اسی عینک سے دیکھنے لگے ہیں، حد یہ ہے کہ آسمانی مصیبتوں کے وقت بھی ہم بعض اوقات گروہ بندی سے آزاد نہیں ہو پاتے۔

اُمت کی فکر سے محروم ہو جانے کا ایک پہلو یہ ہے کہ دینی تعلیم یافتہ حضرات اور عصری تعلیم یافتہ حضرات کے درمیان فاصلے بڑھتے جارہے ہیں، وہ علماء کو از کار رفتہ چیز سمجھتے ہیں، جن کی اصل جگہ 'میوزیم' ہے، اور ہم ان کو بے

دین، خدا ناترس اور خواہشات میں ڈوبے ہوئے لوگ تصور کرتے ہیں؛ حالاں کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں، جب ہمارا دین آؤٹ آف ڈیٹ نہیں ہوسکتا تو اس دین کے علماء کیسے ازکار رفتہ ہوسکتے ہیں، اور نہ یہ سمجھنا درست ہے کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات سارے کے سارے یا اکثر دین بیزار اور خشیت سے محروم لوگ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں بھی ایمان کی روشنی موجود ہے، بہت سے لوگ جو عام لباسوں میں رہتے ہیں، آپ ان کے اندر ایسی خشیت پائیں گے کہ خود آپ کو ان کے ورع وتقویٰ پر رشک آنے لگے گا، اس دوری کی وجہ سے ایسے حضرات جب دین کی خدمت کے لئے آگے بڑھتے ہیں تو نادانستہ طور پر انحراف کے راستہ پر پڑ جاتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء آگے بڑھ کر اس فاصلے کو کم کریں، اپنے علم واخلاق کی تلوار سے ان کے دلوں کو فتح کریں اور انہیں امت کے بہتریں کاموں کے لئے استعمال کریں، یہ وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے کہ جدید وقدیم کے فاصلوں کو سمیٹا جائے اور گروہ بندی کی جگہ امت پن کو فروغ دیا جائے، اس نسبت سے ہر عالمِ دین کو مفتی شفیع صاحبؒ کا رسالہ ''وحدت اُمت'' اور تحریک دعوت وتبلیغ کے دوسرے امیر مولانا محمد یوسفؒ صاحب کی آخری تقریر کو ضرور پڑھنا چاہئے۔

تحقیق وتثبت

بقدر ضرورت دین کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے: ''**طلب العلم فريضة على كل مسلم**'' (سنن ابن ماجة ، المقدمة ، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم ،حدیث نمبر:۲۲۹) یہ علماء کے لئے بھی ضروری ہے اور عوام کے لئے بھی؛ لیکن فرق یہ ہے کہ عوام کے لئے تقلیدی علم کافی ہے کہ وہ کسی عالم سے پوچھ کر عمل کرلیں، کسی کتاب میں پڑھ کر ضروری معلومات حاصل کرلیں؛ لیکن علماء کا علم تحقیقی ہونا چاہئے، اگر کسی حدیث کو سنیں اور اسے بیان کرنا ہو یا لکھنا ہو تو وہ اس حدیث کے اصل ماخذ تک پہنچیں، اس کے بارے میں محدثین کی رائے جاننے کی کوشش کریں، پھر اسے بیان کریں، کسی مسئلہ کی رہنمائی کرنی ہو تو پہلے کتابوں سے رجوع کریں، اس کے مستدل کو جاننے کی کوشش کریں، پھر لوگوں سے اسے بیان کریں، کوئی سبق آموز واقعہ ذکر کرنا ہو تو اس کا حوالہ اور ثبوت دیکھیں، پھر غور کریں کہ یہ واقعہ شریعت کے مزاج کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ اس کے بعد لوگوں کے سامنے اسے پیش کریں۔

ہر عالم میں اس جذبۂ تحقیق کا رہنا ضروری ہے، محدثین اور فقہاء کا ذوق یہ ہے کہ ان کے کسی بزرگ کی کتنی ہی عظمت واحترام دل میں کیوں نہ ہو؛ لیکن جب وہ ان کی کوئی بات نقل کرتے ہیں تو نقد کی کسوٹی پر کس کر اور علم کی ترازو میں تول کر، عقیدت واحترام اور حسن ظن کبھی ان کی تحقیق میں رکاوٹ نہیں بنتا تھا؛ لیکن ہمارے یہاں اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ عمل اور اخلاق کے معاملہ میں تو بزرگوں کا اسوہ پس پشت ڈال دیا جاتا ہے، اور تن آسانی

اور تحقیق وتلاش کی کاوش سے بچنے کے لئے اپنے کسی بزرگ کے حوالہ کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے، علم کے راستہ میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے اور علماء کے لئے بے حد نقصان دہ ہے؛ اس لئے آپ یہ مزاج بنائیں کہ ہر بات کو اس کے اصل ماخذ سے دیکھا جائے اور اہل فن کے نزدیک استناد کے اعتبار سے اس کا کیا درجہ ہے؟ اس کو معلوم کیا جائے، یہ پہلو تقریر میں بھی ملحوظ ہونا چاہئے اور تحریر میں بھی، تصنیف وتالیف میں بھی اور تدریس وفتاوی میں بھی، کہ متاعِ سیم وزر کے معاملہ میں قناعت سے بڑھ کر کوئی وصف محمود نہیں اور علم وتحقیق کے راستہ میں قناعت سے بڑھ کر کوئی شئ عیب نہیں!

دعوتِ دین

جو چیز زیادہ اہم ہوتی ہے، بعض اوقات اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کا ذکر آخر میں کیا جاتا ہے؛ اس لئے یہ حقیر سب سے آخر میں دعوت دین کا ذکر کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ''خیر امت'' اس لئے بنایا ہے کہ اسے پوری انسانیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے بھیجا گیا ہے: ''كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ '' (آل عمران:۱۱۰) اس آیت میں مسلمین اور مؤمنین کے بجائے ''ناس''، یعنی پوری انسانیت کا ذکر کیا گیا ہے، جس میں کفار ومشرکین بھی شامل ہیں؛ بلکہ اہل علم نے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں ''یا أیھا الناس '' کے لفظ سے زیادہ تر مشرکین کو مخاطب کیا گیا ہے، اور امام رازی نے لکھا ہے کہ ''معروف'' سے مراد ''ایمان'' اور ''منکر'' سے مراد ''شرک'' ہے؛ اور امام رازی کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ 'معروف' کا فرد اعلیٰ 'ایمان' ہی ہوسکتا ہے اور 'منکر' کا فرد اعلیٰ 'کفر' ہی ہوسکتا ہے؛ لہٰذا اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ مسلمانوں کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کو ایمان کی دعوت دیں اور کفر سے بچائیں، اسی خاص ڈیوٹی کی وجہ سے وہ ''خیر امت'' ہیں۔

یہ ذمہ داری یوں تو پوری امت پر ہے؛ لیکن جس کا رتبہ جتنا بڑھا ہوا ہو، اس کی ذمہ داری اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے، اگر کسی کے پاس دو لاکھ روپے ہوں تو اس پر اسی لحاظ سے زکوۃ واجب ہوگی اور ایک کروڑ ہوں تو اسی نسبت سے واجب ہوگی، اسی طرح دعوت دین کے سلسلہ میں امت کے عوام کے مقابلہ امت کے خواص کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں اور دوسروں کے مقابلہ علماء کی ذمہ داریاں سب سے زیادہ ہیں، ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں دعوت کے وسیع مواقع ہیں؛ کیوں کہ ہمارے برادران وطن میں اللہ کی معرفت نہیں ہے؛ لیکن اللہ کی محبت ہے، دین حق کی پہچان نہیں ہے؛ لیکن دین کی عظمت ہے؛ اس لئے ان کے دلوں کو فتح کرنا آسان ہے، اور پوری اسلامی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا کے ہر خطہ میں بمقابلہ اہل کتاب کے مشرکین نے زیادہ آسانی سے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔

اس لئے عزیزانِ گرامی ! برادران وطن کے حقوق کو پہچانئے ، کہیں اللہ کے یہاں ہم ان کے بارے میں جواب دہ نہ ہوجائیں اور کہیں رسول اللہ ﷺ کا سامنا کرنے میں ہمارے لئے شرمندگی کا سامان نہ ہو کہ نبی تو دعوت ایمان کے لئے 'طائف'' میں پتھر کھائیں اور ''احد'' میں ان کے خون کے فوارے بہہ پڑیں ؛ لیکن نائبین نبی کے تلوؤں میں اس فرض کو ادا کرنے میں کبھی ایک کانٹا بھی نہ چبھے اور ان کے دل میں انسانیت کے لئے کوئی ٹیس بھی نہ پیدا ہو۔

عزیزان محترم ! ایک عرصہ کے بعد آپ سے ملاقات اور کچھ کہنے اور سننے کا موقعہ ملا ؛ اس لئے اس طویل سمع خراشی کی جسارت کی گئی ہے کہ :

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفاتِ دل دوستاں رہے ، نہ رہے

یہ سیمینار جو آپ حضرات کو جمع کرنے کی ایک تقریب ہے، اس سے آپ ایک نیا عزم وحوصلہ لے کر جائیے ، عزم دین کی خدمت کا ، عزم اسلام کی دعوت واشاعت کا ، عزم امت کو جوڑنے کا ، عزم علم وتحقیق کے نئے چراغ جلانے کا اور عزم خود اعتدال کے راستہ پر رہنے اور دوسرے کو اس پر لانے کا ، اور ان سب کے لئے ضروری ہے اخلاص ، اللہ کی خوشنودی کا جذبہ ، اللہ کے سامنے رونے اور آنسوؤں سے وضو کرنے کا مزاج ، کہ اس کے بغیر پہاڑ جیسا نظر آنے والا کام رائی سے کمتر ہے اور اگر اخلاص اور جذبۂ رضاء جوئی عمل کا رفیق ہو تو رائی نظر آنے والا عمل بھی ہمالیہ سے بڑھ کر ہے ، اخیر میں دعا ہے کہ بارالہا ! آپ اپنے دین کی خدمت کے لئے ہم جیسے خطا کاروں کے یقیناً محتاج نہیں ہیں ؛ لیکن ہم آپ کے محتاج ہیں کہ آپ ہمیں اپنے دین کی خدمت کے لئے قبول فرمائیں اور اپنے غلاموں میں شمار کرلیں ؛ اس لئے ہم سب سے زندگی کی آخری سانس تک اپنے دین کی خدمت لے لیجئے اور اپنی خوشنودی کے عمل پر ہم سب کو اس جہانِ فانی سے اٹھائیے !

ربنا تقبل منا إنک أنت السمیع العلیم .

○ ○ ○